ڈاکٹر کرامت علی مغل، اسسٹنٹ پروفیسر ، ادارہ پنجابی زبان و ثقافت' جامعہ پنجاب لاہور
ڈاکٹر افتخار احمد سلہری،اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ پنجابی،گورنمنٹ کالج یونیورسٹی ،لاہور
ڈاکٹر فرزانہ ریاض،اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اردو،گورنمنٹ کالج یونیورسٹی ،لاہور
Dr. Karamat Ali Mughal, Assistant Professor, Institute of Punjabi Language and Cultural, Punjab University, Lahore
Dr. Iftikhar Ahmed Sulehri, Assistant Professor, Department of Punjabi, Govt. College Universit, Lahore.
Dr. Farzana Riaz, Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. College Universit, Lahore.

اکیسویں صدی کی پنجابی خواتین افسانہ نگار ۲۰۰۰ء تا ۲۰۲۰ء

PUNJABI WOMEN FICTION WRITERS OF THE 21ST CENTURY 2000-2020

Abstract:
In the 21st century, many changes can be seen in the Pakistani society and politics which we can see in the literature written here. Pakistani Punjabi women fiction writers have experimented in these two decades in terms of subject matter and technique. Where Punjabi women fiction writers have talked about their lack of rights, they have described their surroundings realistically. They are describing all kinds of topics like society, politics, emancipation, alliteration, religion, education, migration, partition of India in their fiction too. They are much aware of their society and surroundings and they observe the norms of the society in some unique way which is obvious in their stories too. The role of women fiction writers in the development and promotion of Punjabi fiction writers cannot be forgotten in any way. They also have a variety of themes and also progress in technical terms, due to which Punjabi fiction will improve further in the coming era.

Key Words: *21st Century, Pakistani Society, Politics, Literature, Punjabi Women, Religion, Education, Fiction Writers.*

اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں پاکستان میں پنجابی ادیبوں کی تحاریر میں کئی رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ تنوع کئی اعتبار سے ہیں موضوع اُسلوب اور تکنیک میں نیا پن اُمڈ آیا ہے ۔1947ء سے2000 ء کے دور میں بھی پاکستانی پنجابی زبان کے ادیبوں نے افسانہ نگاری کے فن کو وسعت دینے میں اپنا اہم کردار ادا کیا تھا اور اکیسویں صدی میں بھی ایسا ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ وقت اور سماج میں جو جو تبدیلیاں آئیں اس نے ادب کے میدان کو بھی متاثر کیا جس کے اثرات پنجابی افسانے پر بھی پڑے ہیں ۔ اس دوران پوری دُنیا ایک چھوٹا سا گاؤں بن کر رہ گئی جس وجہ سے کئی مثبت اثرات بھی نظر آتے ہیں جس نے زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس دوران خواتین کی طرف سے جو

افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں ان کا تکنیکی اور تجزیاتی جائزہ لیا جائے۔

عذرا وقار کا افسانوی مجموعہ" اک ادرش وادی دی موت2000 "ء میں شائع ہوا ہے' وہ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔1971 ء کی جنگ کے بعد ملک دو ٹکڑے ہو گیا، علیحدہ علیحدہ رستے بنے اور عذرا وقار کا افسانہ" رستے "سامنے آیا جب وہ ڈیزی کے گھر جا کے عجائب گھر میں لگی جنگ کی تصویریں دیکھتی ہیں تو اس کو تاریخ کی کئی پرتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ڈیزی بتاتی ہے کہ جب بنگلہ دیش میں آرمی ایکشن ہوا تو وہ اپنے بچوں کو لے کر گاؤں میں چھپتی رہی۔ عذرا وقار نے بھی اس سیاسی رنگ کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے" :رستے"کہانی میں عذرا وقار نے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے کے سانحے کے بارے میں بھی بتایا ہے۔ معاشرتی سطح پر خوف نفرت میں بدل جاتا ہے اور یہاں بھی وہی ہوا۔ لکھتی ہیں:

> ساڈا خوف نفرت وچ بدل گیا اے۔ ڈیزی نے کہیا سی۔ ایوب خاں ریاستی جبر دی علامت بن گیا اے۔ سانوں بہت دبیا گیا اے۔ فوج وچ تے وڈیاں ساسیاں تے بنگالی نہ ہوندے برابر نیں۔ ظلم نال سازشاں جمیاں نیں۔ اسیں تہاڈی رعیت تے نہیں 'نہ تسیں بادشاہ

او ‘اسیں وی ایس ملک دی لڑائی لڑی اے۔ پر مالک تسیں بن گئے
او۔ اسیں آپ اپنا مالک بننا چاہنے آں۔[1]

بیس سال پہلے مشرقی پنجاب میں سیاسی پناہ لینے والے کی کہانی" اک آدرش وادی دی موت "کتاب کا عنوان بھی ہے جو بعد میں این جی او کھول کے بنیادی حقوق کو تلاش کر رہا ہے اور آج کے مثالی انسان کی سوچ بھی کافی بدلی ہوئی ہے۔ یہ کیسے اپنے آپ میں رہتا ہے اور برے لوگوں سے لڑتا ہے۔ عذرا وقار کی نظر میں ایسے ہے:

آدرش وادی نے" کیپٹل "بوجھے وچ پائی اے۔ اپنی بقا لئی ہرے
پتیاں نال رل کے ہرا ہو گیا اے۔ وچوں لال اُتوں ہرا۔ پر وچوں
لال وی کتھے رہیا اے۔ کھُنڈے تے زنگارے حرفاں نال لڑائی
نہیں لڑی جا سکدی۔اک پاسیوں اواز آندی اے" ایشیا سبز اے ‘
دوجے پاسیوں اواز آندی اے ‘ایشیا سرخ اے۔[2]

این جی اوز کے علاوہ ملٹی نیشنل کمپنیوں نے ترقیافتہ ملکوں کے کام کاج کو سنبھالنے والا ایشیاکس طرح ہاتھوں سے نکل کے جا سکتا ہے۔ ایشیا کو ایک منڈی کے علاوہ کچھ نہ سمجھنے والی طاقتیں یہاں اُٹھنے والے ہر انقلاب کی آواز کو دبا دیتی ہیں۔ اسی طرح وہ" بے زمینی دا دُکھ "میں سماج کی کئی خامیوں کو دکھاتی ہیں جب گاؤں میں رہنے والے شہروں میں آ کر کسان جیسے رتبے سے نیچے ہو کر مزدوری کرنے کیلئے مجبور ہو جاتے ہیں اور شہروں کو ہی قصوروار اور برا سمجھنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔

ایک اور کتاب" اَج دی مار وی "بھی2000 ء میں ڈاکٹر غزالہ احمدانی کی کہانی میں سندھی کلچر موجود ہے اور ایسے لگتا ہے کہ وہ سندھی ثقافت، زبان اور رسوم و رواج سے بہت متاثر ہیں۔ مسرت کلانچوی کے بقول ڈاکٹر غزالہ احمدانی کے افسانوں کا موضوع انسان اور اس کی پہچان ہے۔ اُن کی کہانی میں تھر میں رہتے لوگوں کے دُکھوں کی باتیں ہیں۔" دھرتی ماء تے بارود دی خشبو "میں نئی سوچ کی طرف سفر کرتی افسانہ نگار نظر آتی ہیں اور انسانیت کیلئے وہ اپنی سوچ کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

میڈے اندر ...اندر...میڈی روح وچ !!...دُور کتھائیں کُتے بھونکدے
پئن ۔لاشیں کوں بھنبھوڑدے پئن ۔کتھاں ہن خدائی فوجدار...؟
کتھاں ہن امن دے پیامبر؟ کڈائیں چیریاں وی امن پھیلا سگھدین ؟
کڈائیں انھیں دا وجود وی امن دی علامت بن سکھیے؟ ڈسکدی
انسانیت دی گلھ کنوں ویندا ہویا ایہہ جبر دا آنسو پونجھو۔(3)

ڈاکٹر غزالہ حمدانی کی ایک اور کہانی" اوں بن ہر تخلیق ادھوری"میں رومانوی رنگ ہے جس میں سارا، چندا بن کر سپنوں میں گم آدمی مون کو اپنی طرف مائل کرلیتی ہے اور جب حقیقت عیاں ہوتی ہے تو سب کچھ جیسے بدل جاتا ہے، بیانیہ ہلکا پھلکا ہے ۔ ایک انداز دیکھیں:

سارا توں اتھاں کیوں آگئی ہیں۔میں چندا نال منگنی ماپیو کنوں لُک تے
پیا کریندا ں۔انہیں کو منگنی کرن توں بعد ڈسمیساں پلیز اتھوں چلی
ونج۔میڈی عزت دا سوال اے "اتلی دیر وچ مون دے سارے
دوست انہیں ڈوہیں دے گرد جمع تھی گئے۔سارا دے اکھیں وچ ہک
خاص انتقام ہا۔آکھیں،اوہ تُساڈی فون فرینڈ میں ہاں۔او
تساڈی Dream Girl میں ہاں۔(4)

یہ ساری بات سُن کر اُس کے ہوش ٹھکانے ہی نہیں رہتے اور اس کو بہت شرمندہ کر دیا جاتا ہے۔ بہت خوبصورت انداز کے ساتھ عورت کے انتقام کے جذبے کو بیان کیا گیا ہے جس میں انسانی نفسیات دکھائی دیتی ہیں۔ اسی لئے مسرت کلانچوی آپ کی کہانیکاری بارے اس طرح لکھتے ہیں:

اوندے افسانے پڑھدیں ہوئیں ایویں لگدے جو اساں اندھاری
سُرنگ وچ ٹُر دے ٹُر دے یک دم سوجھلے وچ آ گئے ہوئوں
جِتھاں ساڈے چار چفیرے ساول تے پُھلاں نال لڈی زمین ہے
تے اُچا نیلا آسمان۔تازی ٹھڈی ہوا تے روشنی ای روشنی۔(5)

"روپ سروپ "شگفتہ نازلی کے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے افسانچوں میں بڑی گہری باتیں کہہ دی ہیں اور قاری کو چند سطروں کی کہانی میں کوئی بڑی سوچ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ کسی بھی افسانہ نگار کی بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ ایک بڑے موضوع کو چند الفاظ میں سمیٹ دے اور انہیں کچھ لفظوں میں بیان کر دے۔ شگفتہ نازلی کے افسانچوں کو پڑھ کے صاف نظر آتا ہے کہ وہ اس فن سے مالا مال ہیں۔" رب نیڑے شہ رگ توں "اور" ازلی تے ابدی خاہش "جیسی کہانیوں میں وہ رب کی تعریف چند لفظوں میں بڑے خوبصورت انداز کے ساتھ بیان کرتی ہیں اور اس کے علاوہ کہانی" ازلی تے ابدی خواہش "میں ماں جی کے کردار کے ذریعے وہ اس خواہش کو بیان کرتی ہیں جو کہ ہر مسلمان کی خواہش ہے کہ جب اُن کا آخری وقت آئے تو اُن کو کلمہ ضرور نصب ہو۔اس کے علاوہ وہ" نصیحت تے وصیت "افسانے میں ماں کی محبت کا ذکر کرتی ہیں اور اس کے علاوہ بہنوں میں جو پیار ہوتا ہے اُس بارے ذکر کرتی ہیں کہ وہ کس طرح ایک دسرے کی سہیلیاں بھی ثابت ہوتی ہیں اور کس طرح ہر دکھ درد میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتی ہیں۔ یہ بھی اردگرد کی رہتل سے نکلا ہے۔" ماں تے ماں بولی "کہانی میں وہ مادری زبان کی اہمیت ایسے بیان کرتی ہیں کہ جتنی ہمارے لئے ماں ضروری ہے اُتنی ہی ضروری مادری زبان بھی ہے۔ جِتنی عزت ہم اپنی ماں کو دیتے ہیں اُتنی ہی عزت مادری زبان کو بھیدینی چاہیے۔

اوئے نادان !توں اپنی ڈگری نوں کیوں ساڑ رہیا ایں۔ اک بیلی نے
ڈوجے توں پچھیا۔ جے ڈگری لے کے وی مزدوری ای کرنی اے تے
فیر ایہہ بوجھ کیوں چکدا پھراں۔ ڈوجے نے سمجھایا۔(6)

ان سطور میں شگفتہ نازلی ہمارے معاشرے میں تعلیم کی بے قدری چند الفاظ میں بڑے خوبصورت طریقے سے بیان کرتی ہیں اس کے علاوہ ہمارے معاشرے میں بڑھتی ہوئی بیروزگاری کو تنقید کا نشانہ بناتی ہیں اس بیروزگاری کی وجہ سے ہمارا نوجوان طبقہ تعلیم سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

زویا ساجد کی کتاب" سرل سول "بھی افسانہ کے میدان میں دلکش انداز کے ساتھ اپنے ارد گرد کے کرداروں کو اور فلسفے کو بڑے خوبصورت ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ وہ زیادہ تر اختصار کے ساتھ لکھنے کو ترجیح دیتی ہیں پر جب بات لفظوں کے ذریعے تصویر کشی کی ہو تو وہ لفظوں کے ساتھ ایسی تصویر بناتی ہیں جس کے ساتھ سارا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ لکھتی ہیں:

> بارِیوں باہر پردے پچھے چانن جیہڑا رات نکن دا سنیہا وی سی ابھڑواہے سرمئی انھیرے وچ بدل گیا سی۔ایہہ سرمئی انھیرا کمرے دیاں کندھاں دے لُوں لُوں راہیں اندر پُجیا تے اوہنوں نِگھ تے ٹھنڈ دوویں محسوس ہوئے۔ کمرے دی لوء شامر نگی کر کے بدل اندر ای کھلو گئے سن(7)

زویا ساجد کی ایک اور کہانی" بانوری کتھکنی"میں جہاں آرا کی کہانی ہے جس کو کہانی بیان کرنے والی کے ساتھ گہرے رشتے میں دکھایا گیا ہے جہاں آرا اگلے جہان جا چکی ہے پر اُس کے ساتھ گزرا وقت وہ کبھی بھی نہیں بھلا سکی اور یہی کہانیا د وں میں گھومتی رہتی ہے۔

> مرن توں اِک سکنٹ اگدوں تیری روح میرے اندر آ گئی سی۔ صرف تیرا سریر نکمت ہویا اے۔روح نہیں۔روح دے پاندھیاں اندر توں حالے وی زندگی دے منچ تے ویں۔تے اسیں سبھ علی آڈیٹوریم چ تیری پرفارمینس ویکھ رہے آں۔جتھے تیری نانی دیاں اَکھاں وچ میں خُشی دے اتھرو ویکھے سن۔(8)

زویا ساجد معاشرتی لحاظ سے وہ مسئلے بھی سامنے لاتی ہیں جنھیں حل کرنے سے انسان کی زندگی میں نئے رنگ دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ نئے رنگ ہی آپ کی کہانی کی پہچان ہیں۔

عبیدہ سید کی کتاب" فیر کیہ ہویا"میں لکھی گئی کہانیاں سماجی کا آئینہ دکھاتی ہیں۔اس میں" بھلیکھا "کہانی ہے جس میں ڈاکٹر اپنی ملازمت کی شرافت بھول کر لڑکی کے ساتھ ریپ کر کے جنسیت کا پرچار کرتا ہے۔ معاشرے میں موجود گھٹن اور جنسی طور پر ہراساں کرنے کے

عمل کو جیسے آگے بڑھاتا ہے وہ معاشرے کی کسی بات کو چھپانا پسند نہیں کرتا اسی لیے تو جنید اکرم تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> عبیدہ سیّد تے جویں کہانی لکھن ویلے ہتھ وچ قلم دی بجائے ڈانگ پھڑ لیندی اے تے اوہناں سارے کالے مونہاں والیاں دے مونہہ ننگے کردی جاندی اے جیہڑے معاشرے وچ اپنا اصلی روپ لکو کے بہروپیے بن کے ٹُر دے نیں(9)

دُوسری کہانی" اکو راز دار "ہے جو شادو کے ساتھ شادی نہیں کرتا اور شادو نیلا تھوتھا کھا کر مر جاتی ہے۔ نعمان جاگیرداروں کا لڑکا ہے جو شادو کو اپنے جال میں پھنساتا ہے پھر اُس کی عزت برباد کر دیتا ہے۔ شادو کا بھائی بڑے سائیں کے پیر پکڑتا ہے، منتیں کرتا ہے پر آگے سے ظلم اور جبر ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ یہی جاگیردارانہ نظام کے خلاف اُٹھنے والی آواز کو دبانے کے جتن کرنے والا ہے۔

> ساڈی بیٹھک وچ وڈے سائیں اپنی کرسی تے جاہ وجلال دا نمونہ بنے بیٹھے سن۔نذیر اوہناں دے پیراں وچ بیٹھا رو رہیا سی۔ہتھ جوڑ رہیا سی۔(10)

رفعت کی کتاب" بتی والا چوک2003 "ء میں شائع ہوئی، اس میں انہوں نے عورتوں پر ہونے والے مظالم موضوع رکھا' سیاسی اور سماجی لحاظ سے عورت کے کردار میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ملتا۔ رفعت کی افسانہ نگاری کے بارے بات کرتے ہوئے فلیپ پر الیاس گھمن لکھتے ہیں:

> رفعت جی دیاں رچناواں پنجابی فکشن دا وقار اچ ودھایا کہ اسیں بڑے مان نال ایہناں نوں دُنیا دے اعلیٰ افسانوی ادب دے موہرے رکھ سکنے آں۔(11)

صوفیہ شاذ کی کتاب" اجیت پریتاں2003"ء میں شائع ہوئی ہر افسانے کے بعد ایک نظم بھی شامل کر دی گئی ہے۔ آپ کی کہانی کاری پر عورتوں کے ڈائجسٹ کا بہت زیادہ

اثر دکھائی دیتا ہے اور ہر کہانی میں عورت کو ہی اچھا ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ پوری کتاب میں پنجابی املا کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔

اس کتاب کی پہلی کہانی" اتھری "میں اُپلے لگانے والے لوگ ساگ کھاتے کرداروں کے ساتھ پنجاب کے گاؤں میں بستے لوگوں کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ شالو اور ہیرے کی خوشگوار زندگی میں پراندے بنانے والی ریشم آ جاتی ہے' اس موقعے پر شالو جو فیصلہ کرتی ہے اس کے لفظ دیکھتے ہیں:

> ماں بس اوہنا ں نوں کُڑی پسند سی۔اوہ انج وی بے سہارا سی تاں میں اوہناں نوں اجازت دے دتی۔جے اوہ مینوں چھڈ کے کدھرے ہور ٹُر جاوے تے میں رہ پاندی؟میں اپنے بچے کولوں اوہدا باپ ... تے اوہنا ں نوں ویکھے بغیر میں کویں رہ سکنی آں؟(12)

شالو کا کردار روایت سے آگے نکل کر حقیقت کو قبول بھی کرتا ہے اور سماج کا وہ سچ بھی دکھائی دیتا ہے جس کے ساتھ مرد کی سماج میں برتری اور کسی عورت کی قربانی کی صفت کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ شالو کی ماں کا کہنا " نی کیہ پئی کہنی ایں نصیباں والیے؟"بھرپور طنز ہے۔اس مجموعے کی ایک اور کہانی" بھجندی نار تے مچدا بھانبڑ "جس میں چھمو اور شیرے کی روایتی کہانی جو پہلے چھموں کو جاتی کو چھیڑتا ہے پھر اُس کو اپنا لیتا ہے اور اپنے چھیڑنے کو اور اُس کو باقی بھوکی نظروں سے بچانا بتاتا ہے۔

> نی جھلیے ،تُوں تاں پوری اَگ ایں،میرے دِل وچ بھانبڑ اودوں ای مچن لگ پیا سی جدوں توں اوتھوں نٹھی سیں ...بھلیئے،ایہہ نار تاں نار ای اے،دس تینوں چنگا لگدا جے اوس ویلے ...ہوراں دے دِلاں وچ ایہو بھانبڑ مچدا؟(13)

ان کہانیوں میں بناوٹی رنگ زیادہ ہے، انتساب کے بعد افسانہ نگارنے" نکی جہی گل"کے عنوان کے تحت جو لکھا اُس کی پہلی سطر دیکھیں:

> صوفیہ شاذ نوں آندا جاندا کجھ نہیں ...خورے کیہ لکھیا سو؟(14)

اُن کی کہانیوں کو جب فنی لحاظ سے پرکھتے ہیں تو اُن کی لکھی بات پر یقین کرنے کو دل کرتا ہے۔

پروین ملک نے "کیہ جاناں میں کون "کے بعد دُوسری کتاب پنجابی ادب کو" نکے نکے دُکھ"دان کیا۔ اس کتاب میں چھاچھی رنگ کی تین کہانیاں ہیں باقی تیرہ کہانیاں راوی رنگ کی ہیں۔ پروین ملک اپنے معاشرے سے جڑی ہوئی ہیں اور یہی جڑنا اُن کی کہانیوں میں بھی موجود ہے۔ آپ نے کردا ر نگاری پر بہت زور دیا ہے، وہ بھی صحیح شیشہ دکھاتی نظر آتی ہیں۔ راجا رسالو، آپ کی افسانہ نگاری کے بارے لکھتے ہیں:

> پروین ملک نوں کہانی لِکھن تے لوکاں تک اپڑان دا وَل آندا اے۔ اپنیاں کہانیاں وچ پینڈو تے شہری وسیب دا نقشا ڈاڈھے سوہنے انداز نال کھِچیا اے۔ پروین ملک معاشرے وچ کھِلریاں ہوئیاں سچائیاں نوں کھُلیاں اَکھاں نال ویکھدے نیں۔ اوہ بیتے سَمے دے قصے کہانیاں تے روایتاں نوں اپنیاں کہانیاں دا موضوع بناندے نیں۔ عورت اُتے ہون والے ظلم تے جبر نوں نویکلے انداز نال پیش کردے نیں۔(15)

پروین ملک کے پاس سماج میں پھُوٹ رہے بے انتہا موضوع ہیں اور ان کو بیان کرنے کیلئے لفظوں کا ذخیرہ بھی ان کے پاس کمال کا ہے۔ تکنیکی فن کو اس کتاب کی بلندی پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں جہاں ماضی میں گم ہوئے کردار نظر آتے ہیں وہیں اپنے آج کے ساتھ کل کیلئے لڑتے ہوئے کردار بھی دکھائی دیتے ہیں جس لئے ان افسانوں میں ایسا تاثر چھا جاتا ہے جو ان مٹ اور قاری کیلئے بہت من بھاتا بن جاتا ہے۔" حصہ بکھڑا"کی قریشاں بی بی کو اس کے نصیبوں کو اُس کے اندر اور باہر کی زندگی کو بڑے خوبصورت انداز کے ساتھ پروین ملک نے لکھا ہے۔ قریشاں کی سوتیلی ماں نے جب اپنا پورا زور لگا کر نائن کو تِلے کی کڑھائی والا جوڑا اور کانوں کی بالیوں کے علاوہ ہزار رُوپے دے کر علی نواز کے گھر اُس کا رشتہ کروا دیا تو لوگوں نے منہ میں اُنگلیاں دبا لیں وہ قریشاں کی سوتیلی ماں کو سگی ماں کی طرح ہی

فرض ادا کرنے والی سمجھنے لگے۔ ہر طرف اس کی شاباش ہو گئی۔ قریشاں پھولوں کے باغ میں چلتی بھکڑے کے کنارے پر اُس وقت آ جاتی ہے جب علی نواز کہتے ہیں:

"بلے بئ بلے تیرے ورگی تاں ہزار رُپئے وچ وی نہ لبھے۔(16)"

یہ علی نواز وہی ہے جو ملکی سیاست میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے پروین ملک نے ایسے سیاستدانوں کے اعمال کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو اس دھرتی کے ساتھ ہی نہیں بلکہ نام نہاد لیڈروں کے ساتھ مخلص ہو جاتے ہیں جو دھرتی کی بجائے اپنی ترقی کی بات کو آگے بڑھانا ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

علی نواز دا ٹبر ہمیش توں پنڈ دی سیاست وچ اگے اگے رہندا سی۔ اوہدا دادا پاکستان بنن ویلے توں ووٹاں پوان وچ موہری محرری ہوندا اے فیر جتن والے امیدوار نال اوہدا کوئی نہ کوئی ناتا تعلق جڑیا ای رہ جاندا اے جہڑا اگلیاں الیکشناں تیکر برقرار رہندا اے۔ علی نواز دے پیو نے اک واری اک پیر ہور اگانہ ودھایا تے آپ الیکشن لڑن دا آہر چا کیتا۔ پر پتا ایہہ لگا پئی حالی الیکشن جِتن والی منزل بہوں دُور اے 'ایس تجربے توں پچھوں اوہنوں ورکر رہن وچ ای فایدا نظر آیا۔(17)

"اک سی راجا"...میں بھی پروین ملک سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں:

خلقت نوں زمین دی بھٹھی وچ دانیاں وانگوں بھُن کے اوہ مزے لے رہیا سی۔(18)

اس کہانی میں راجے کی کہانی کو بڑے جذباتی انداز سے بیان کیا گیا ہے اور راجے کے گھر بودے کے ساتھ نئی آنے والی دُلہن لئی ٹھہرنا کیسے مشکل ہو ہو جاتا ہے پھر وہ جمہوریت کی طرح ہمارے دیس سے نکل جاتی ہے۔ اُس کے پیچھے پیچھے راجہ بھی ساتھ ہی گم ہو جاتا ہے۔ پروین ملک جب" دور دور تیکر قیامت دا ناں نشان کوئی نظر نہ آیا "کہتی ہیں تو اس میں بڑی گہرائی کے ساتھ کرداروں میں بیان ہے:

میرے چونہواں پاسے بارُود دی بو اے تے میرے جُثے وچ دھماکے۔ میریاں ساریاں شہر وچ گواچے لعل تے میں کلی ماں۔(19)

مسرت کلانچوی کی کتاب" تھل مارُو دا پینڈا2005 "ء میں شائع ہوئی جس میں خواتین کی بھی بات ہے اور خواتین کی سماج میں کیا حالت ہے اس کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔" ساری عمر گذاریم"میں پرنسپل مسز زیب النساء کی ریٹائرمنٹ کے کاغذ جب کلرک ٹائپ کر رہا ہوتا ہے تو اس کے دل میں خوشی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہوتا ہے کیوں کہ اس کو اچھے برے سے ٹوکنے والا کوئی بھی نہیں رہ گیا۔ اس کو مسرت کلانچوی ایسے بیان کرتی ہیں:

سروس تاں میڈم دی پوری تھی گئی ہے۔ایہہ کاغذ جہڑے میں ٹائپ بیٹھا کریندا اں،انہیں دی ریٹائرمنٹ دے ہن۔ اَج ساڈی بے تاج ملکہ تخت توں لہہ ویسی۔ویسے اُوندا عرش توں فرش تے لہون کیویں لگ سی یار(20)

اپنے علاقے کی بات کرنا مسرت کلانچوی کو بہت پسند ہے اس کتاب کی ٹائٹل کہانی "مارو تھل دا پینڈا"میں وہ اپنے اس پیار بارے ایسے لکھتی ہیں:

اَساں جتھوں آئے ہَیں آخر اُتھائیں ول ونجاں ہوندے۔میکوں تاں خواباں وچ وی کلانچوالے دی مٹی ہَکلاں مریندی ہے۔مائنر دے بنّے توں لہہ تے وستی دو ونجو تاں نکّے جہے ٹبّے تے جالیں گُستان تے چھاں کیتی کھڑیاں ہن۔اِتھاں جالیں تے لگیاں رتیاں ساویاں پیلھوں،پیلھیں سریہہ ڈاڈے دی حویلی آلی وڈی ساری بیر تے بوا دے کوٹھے نال نم دی خوشبو میکوں سڈیندی ہے۔(21)

فرخندہ لودھی کا افسانوی مجموعہ" کیوں "میں آج کے دور کے انسان کو اور اُس کے ساتھ جُڑے رنگ رنگ کی بیتی کہانیوں کو موضوع بنایا ہے۔ منشا یاد لکھتے ہیں:

1947دے المیے نوں ذہن وچ رکھ کے اُلیکی گئی ایہہ سدھی سمُچی کہانی علامتی پدھر تے وی اپنی پچھان آپ اے۔ انساناں دے ساڑھ

سیاپے دے دُکھ پڑھن والے نوں اپنے کلاوے وچ لے لیندے نیں۔(22)

فرخندہ لودھی کا اسلوب پنجابی افسانہ نگاروں میں سب سے بڑھ کر من بھانے والا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد میں کہانیاں پھوٹتی دیکھ کے لکھتی ہیں۔ اسی لیے تو ان کے افسانوں میں دھرتی کی مٹی کی مہک آتی ہے۔ مُرجھائے ہوئے پھولوں جیسے کردار بھی وہ اسی دھرتی پر اُگے درختوں سے لیتی ہیں۔ وہ سچ لکھتی ہیں اور سچے کرداروں کے ساتھ کہانی بناتی ہیں اورانملی باتیں کرتی ہیں۔" بوٹیاں "افسانے میں وہ تقسیم سے پہلے اور بعد کا معاشرہ دکھاتی ہیں۔ وہ بتاتی ہیں:

ہُن .....ہُن ...مُنی !ایہہ جہڑا ساڈا دیس پاکستان اے ناں سمجھ لے ایہہ تیرااوہی حلال کرکے سٹیا اونتھ اے۔ ہر بندا اپنی اپنی چھڑی چھڑی بوٹیاں نال اپنا اپنا تھیلا بھر رہیا اے۔ مینوں تے انج لگدا اے چوراہے وچ میں پیا واں۔ کوٹھے جڈی لاش میری اے۔ لوکیں ازادی نال میرے بیرے کر رہے نیں۔(23)

" نرقوم "فرخندہ لودھی کے نمایاں افسانوں میں سے ایک ہے۔ مذہب اور تعصب کی جو دیوار انسان نے اپنے ارد گرد کھڑی کر دی ہے وہ بڑی ایجادات کے دور میں بونے پیدا کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس خامی کو دیکھتی ہے جیسے:

مسلمانو !تُسیں گھابرو نہ۔ اللہ دا وعدا اے۔ اخیر تُساں ای دنیا تے راج کرنا اے۔ مسلمان جوانو !تُسیں نر قوم جے۔ اُمت ودھائو۔ روزی تے رب نے دینی اے۔
شہادت تہاڈی منزل ہونی چاہیدی اے۔(24)

"کم دھندا "کہانی میں بھی سماج کی اجتماعی سوچ نکھر کے سامنے آتی ہے۔ جب مادیت پرستی کے ساتھ کوئی بھی طبقے کی بنیاد رکھتاہے تو وہاں اچھی قدریں کیسے بڑھ سکتی ہیں۔ آپ کے ہر افسانے میں موضوع میں نیاپن دیکھا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ کی کتاب" پچھتاوا2007 "ء

میں چھپی۔ ویسے تو وہ رومانوی افسانہ لکھتی ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو سماجی پس منظر رکھتی ہیں۔ ان میں "پینو ڈاکٹرنی "اپیل کرتی ہے یہ ایسے کردار کا افسانہ ہے جو پیسے کی خاطر اپنا تحقیقی مقالہ فروخت کر دیتی ہے پر اس مجبوری کو وہ کمزوری اور اپنی" مزدوری "بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ وہ لکھتی ہیں:

> میں اپنا مقالہ کافی معقول رقم تے ویچ کے اپنی ماں دا اپریشن کروا لیا۔ ماں ٹھیک ہو گئی۔ مینوں ایس طرحاں رُپئے کماون دا چسکا پے گیا۔ لوکی رات دے انھیرے وچ آ کے اپنا ٹاپک دے جاندے۔ ادھی رقم ایڈوانس لے کے کم شروع کر دیندی۔(25)

سماج میں پلیجرازم) سرقا (کرنے میں ہمارے سماج کی ایک نئی شکل سامنے آتی ہے۔ پوری دنیا میں جس کا سوچا بھی نہیں جاتا وہ یہاں ہو رہا ہے اور دلشاد ٹوانا نے اس موضوع پر پہلی بار پنجابی زبان میں لکھا گیا ہے۔" لاوارث "میں زلزلے کی تباہ کاریوں کے حالات بتائے گئے ہیں کہ کیسے ایک کروڑ پتی ککھ پتی بن کے لاوارثوں کی طرح گھومتا ہے اور جس کے فیشن کی نقلیں ہر کوئی کرتا تھا آج اُس کی آنکھوں میں آنسو اور پھٹے کپڑے تبدیلی کی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ دلشاد ٹوانہ خاتون ہونے کے ناتے خواتین کا سماج میں بدلتا ہوا رتبہ اور مقام دیکھ کے خوش ہوتی ہیں پر اس کے ساتھ ساتھ عوام بھی اس سوچ پر ہی نظر آتے ہیں جس میں خاتون کو ہی قصور وار ٹھہرایا جاتا ہے۔" پیار دی جِت "کہانی میں وہ یوں کہتی ہیں:

> تیری جہی فیشنی نوں تے ہور ہتھیرے منڈے لبھ جان گے پر ساڈے خاندان وچ منگنی توڑنا بہت وڈا عیب اے۔(26)

آج بھی معاشرے میں انہی پرانے رسم و رواج کو گلے سے لگا کر رکھا جاتا ہے۔ معاشرے میں ٹوٹی ہوئی منگنی والی لڑکی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور ہر طرح اُسی کو قصور وار ٹھہرایا جاتا ہے جو طبقاتی سطح پر بڑی جہالت کا آئینہ دار ہے۔" اسیں کیہ کریئے "اور "ڈنگر "میں عورت کو کسی چیز کی طرح برتنے والوں پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔رابعہ خان کے افسانوں کی کتاب" ساہویں سُول بسیرا2007 "ء میں چھپی۔ ان کی کہانیوں میں گھریلو زندگی بھی

ہے اور گھریلو زندگی سے باہر کی زندگی بھی جو حقیقت کے رنگ میں بہت ہی رنگا ہوا ہے اور اس کو بیان کرنے کا ڈھنگ بھی نئی حقیقت سے بھراہوا ہے جس کے ساتھ نئی معاملات سامنے آتے ہیں۔وہ کمزوروں کے حقوق پر سمجھوتہ کرنے والوں کا بھی محاسبہ کرتی ہیں اور کمزوروں کی آواز بن جاتی ہیں، اپنے بارے بات کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

> میڈے چار چفیریوں قصے ہن، تیڈے میڈے غریبی دے ،بے وسی تے بیماری دے ، ہینے تے ڈاڈھے دے،وڈے تے چھوٹے دے،گودے تے بانہے دے،کمزور تریمت تے اوندے اُتے شاہی کریندے مردیں دے،اللہ دے ناں تے درباریں تے بیٹھے پیریں دے،رہبری دے ناں تے غریبیں کوں بے وقوف بنیندے سیاسی اگوا نیں دے ،اُچے اُچے عہدیں تے بیٹھے نکے نکے لوکیں دے(27)

اس کتاب میں گیارہ افسانے شامل ہیں اور ہر افسانہ پڑھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتا ہے کیونکہ مصنفہ نے کردار نگاری کو پورے فنکارانہ انداز کے ساتھ بیان کیا ہے کہانی میں کہیں بھی بناوٹی رنگ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کردار نگاری کے ہنر سے وہ اچھی طرح واقف ہیں اور ان کی کہانیوں میں اس کے ساتھ بخوبی رنگ جمایا گیا ہے۔" بختتیں آلی "ہے، سجو اس کہانی کی مرکزی کردار ہے جو ایک کمزور خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ سجو کا باپ اُس کے لاڈ اٹھاتا ہے سجو کو بکری کا ایک میمنا مل جاتا ہے اور وہ اس کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے، ایک دن گھر والوں کا پیر آتا ہے تو اس کی خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ جاتے ہوئے وہ بکری کا میمنا مانگ لیتا ہے جس کو گھروالے اپنے اچھے بخت سمجھ کر اُس کو دے دیتے ہیں تو سجو کے ذہن میں سوال پیدا ہوتے ہیں۔ سجو سوچ رہی ہوتی ہے ک اس کو فروخت کر کے ماں کی" چمکتی چمکتی " جوتی لے گی۔ جب سجو اپنی سوچ ماں کو بتاتی ہے تو وہ کہتی ہے ہمارا پیر ہمارے لئے دعا کرے گا تو سجو کہتی ہے کہ پیر اپنے واسطے دعا کیوں نہیں کرلیتا کہ رب اُسے اپنا میمنا دے دے اور یہ میمنا اُس نے اپنی بیٹی کو ہی دینا ہوگا۔ رابعہ رحمان کے الفاظ میں دیکھیں:

اماں ملک صیب دا قرضہ کیویں لہسیوں ،میں تیکوں جُتی کیویں گھن ڈیساں۔ سجو ڈُسکن پئے گئی۔

"میڈی دِھی اللہ پوریاں کریندے ،پیر سئیں ساڈے قرضے لہاون دی دعا کریسن"

"اماں پیر سئیں اپنے کیتے دعا کیوں نی کریندے(28)"

یہاں افسانہ نگار نے کئی سوالات کو بھی جنم دیا ہے اور سماج کی اندرونی حالت کو بھی بیان کر دیا ہے۔ اُس سماج میں پیری فقیری نے جہاں اپنی جڑیں مضبوط کی ہوئی ہیں کہ اُن کے خلاف جانا عام بندے کے بس سے باہر لگتا ہے۔" مرشد "افسانے میں لوگوں کی منافقت والی سوچ کو دکھاتے ہوئے آج کے دور میں انسان کے چہرے بدل بدل کر جینے کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہیں نہ کہیں تو انسان کو سچ کا سامنا کرنا ہی پڑ جاتا ہے۔

اتھ ہر بندہ خول در خول چڑھائی ودے۔پر بندے دی حیاتی وچ کجھ اینجھے لمحے وی آندن جیڑھے ویلے اُصول بھنڑ تے خول لہاون کوں روح کریندے تے ول کئیں مہربان دوست دے مونڈھے تے سر رکھ تے بالیں وانگوں روون کوں دل کریندے۔(29)

سعیدہ مختار یونس کی پہلی کتاب" دُونا رُوپ "دسمبر2008ء میں چھپی۔ مقصود ثاقب آپ کی افسانہ نگاری کے بارے لکھتے ہیں:

سعیدہ مختار یونس کہانی گھڑن بناون دی کاراگری تاں نہیں کیتی پر میل بند جیون وچ قدرت نے سماجی ویہار دا ٹکراء سگواں اُلیک دھریاایے۔(30)

تاثر کے بغیر افسانہ ایک رپورٹ کے سوا کچھ بھی نہیں رہتی۔ سعیدہ مختار یونس نے اسی بات کو توڑ پہنچانے کیلئے اپنی کتاب کے ہر افسانے کو تاثر کے ساتھ بھر دیا ہے۔ آپ نے فطری انسان کی عکاسی کی ہے اور اُن کو انسانی فطرت کے جھلکارے صرف دیہاتی زندگی میں ہی ملتے ہیں۔ سعیدہ نے دیہاتی زندگی کے کئی روپ رکھتے کرداروں کو اپنی کہانی میں سمویا ہے جس

کے ساتھ دھرتی اور معاشرے کے ساتھ سانجھ اور پکی ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے سعیدہ کا دیہاتی زندگی کے ساتھ کوئی ایسا ناطہ ضرور رہا ہے جس کو وہ کبھی بھی اپنے اندر سے نہیں نکال سکیں۔ منشا یاد دیباچے میں ایسے فرماتے ہیں:

سعیدہ یونس دیاں کہانیاں پڑھدیاں احساس ہوندا اے پئی ایہہ اک بمار وسیب دیاں کہانیاں نیں۔ ایس وسیب نوں بھکھ ،جہالت ،تعصب ، ظلم ،ناانصافی تے خد غرضی دے روگاں نتانیاں کیتا ہویااے۔(31)

سعیدہ مختار یونس نے1947 ء کے وقت کی تقسیم کو بھی ایک کہانی کا موضوع بنایا ہے۔ وہ کہانی ہے" سگویں نکو "یہ نکو برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے وقت آنے والے مہاجروں میں سے ایک ہے۔ یہ اپنی منزل پر نہیں پہنچتی بلکہ راستے میں ہی کہیں گم ہو جاتی ہے۔ یہاں کہانیکارہ نے اوس وقت راستے میں گم ہونے والی لڑکیوں کے کرداروں کو خوب نبھایا ہے۔ نکو کسی کوٹھے والی کے ہتھے چڑھ جاتی ہے اور نکو کا باپ جب اس کو مُجرا کرتے دیکھتا ہے تو سماج کا وہ چہرہ بھی دکھائی دیتا ہے جو اچھائی کی چادر اوڑھ کر برائی کو پھیلا رہا ہے۔ جلال دین کے گائوں میں آدھے مسلمان، آدھے ہندو بستے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو احترام کے قابل مانتے تھے اور احترام کے جذبے رکھتے زندگی گزار رہے تھے۔ اس کہانی کی کچھ سطور دیکھیں:

پنڈ وچ جے کسے نوں ماتا نکل آوندی تے اوہ وڈا ہووے یاں چھوٹا ، ہندو ہووے یاں مسلمان اوہنوں ماتا رانی تے لے جا کے پتھراں تے اوہدا متھا ٹیکدے تے جھاڑی دوالے چکر لواندے۔ جے کوئی بچ گیا تے جانو ماتا رانی دی نظر سوّلی ہو گئی اے تے جے کوئی گزر گیا تے ماتا رانی دا قہر پیا اے ،بے ادبی ہوئی ہونی اے۔(32)

شاہدہ دلاور شاہ کی کتاب" تڑکے گھڑے دا پانی2008 "ء میں چھپ چکی ہے۔ آپ کرداروں کو، کرداروں کے ساتھ جڑے واقعات کو بڑے حقیقی انداز کے ساتھ بیان کرنے پر یقین رکھتی ہیں۔ اس کتاب کی یاد رہ جانے والی کہانی" قسمت پُڑی "ہے، جو سویر انٹرنیشنل میگزین میں چھپی تو پنجابی حلقوں میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ اس کہانی میں کہانیکارہ نے اوس ویلے

کہانی کی بڑھوتری کیلئے دیا جانے والا ایوارڈ" رضیہ فرخ "ایوارڈ بھی اس کہانیکارہ کو ملنا اس بات کا بھی ثبوت تھا کہ یہ کہانیکارہ بہت اچھی کہانی لکھتی ہے۔ آج کے انسان کی معاشی حالت اُس کو سوچوں میں ڈالے رکھتی ہے۔ شانی کو جب زندگی کی حقیقتوں کا پتہ چلتا ہے تو اس کو سوچیں گھیر لیتی ہیں۔ کہانی" کتھے وے تیرا پیار "کی سطور میں دیکھیں:

مجبوریاں آپ ای سدھراں دے ساہ گھٹ دیندیاں نیں جدوں چُلھے بُجھن لگ پین تے گھڑیوں پانی لیک جاوے۔ دِیوے وچ لو سَت نہ رہوے تاں سوچاں پرت پیندیاں نیں۔(33)

شاہدہ دلاور شاہ دی کہانیکاری بارے بات کرتے راجا رسالو کہتے ہیں:

ایہہ کہانیاں ساڈی رہتل تے سماج دی سچی فوٹو کھچدیاں نیں۔ سرناویں توں لے کے اخیر تیک قاری نوں کدھرے وی خیالیا ں ہوائی کہانی دا جھوَ لا نہیں پیندا۔ ہر کہانی لگدی اے اوہناں تے آپ واپری اے ہر کہانی دا ہر کردار اوہناں دا اپنا کردار لگدا اے۔(34)

آپ نے افسانہ نگاری میں نیا انداز لانے کی بجائے رِیت کے مطابق لکھی جا رہی کہانی کو ہی اپنایا ہے پر کہیں وہ ایسا موضوچ چُن لیتی ہیں جو پڑھنے والے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے جیسے کہ اُن کی کہانی" اوہدیاں اوہی جانے "میں چھنو کے دل میں آیا سوال کئی سوچوں اور فکروں کو بیان کر جاتا ہے۔ چھنو کے الفاظ میں ہی دیکھیں:

رَبّا اپنی لوکائی ہار توُں وی بے بس تے بے اختیار ایں۔(35)

نگہت خورشید کی کتاب" ہر گُچھا زخمایا2010 "ء میں سامنے آیا،یہ افسانے روایتی ہیں جن میں عورت کو مظلوم اور مرد کے معاشرے میں آزندی کیلئے لڑتے دکھایا گیا ہے۔ افسانہ نگار کو منافقت بالکل پسند نہیں ہے جس وجہ سے ہر افسانہ میں سماج کی جو تصویر دکھائی گئی ہے وہ بالکل ویسے ہی ہے جیسا سماج ہے۔ یہ سچ لکھتے ہوئے مصنفہ نے بڑے تگڑے انداز کے ساتھ اپنے اندر کی کڑاوہٹ کو بیان کیا ہے یہ کڑواہٹ اسی معاشرے کی دین ہے جہاں اپنے حقوق

کیلئے لڑتا خواتین کا طبقہ اپنے آپ کے ساتھ ہونے والے ظلم کو بھی بیان کر دیتا ہے۔ معاشرے کی بری رسموں اور سوچوں کو خواتین کے سر سوار کر دیا جاتا ہے۔ نگہت خورشید اپنی کہانی" بے وس "میں اسی روگ اور خواتین کی بے بسی کو ایسے بیان کرتی ہیں:

میری وڈی بھین اگے ای چاچے دے وڈے پُتر گھر حیاتی دے کئی روگ پالی کھلوتی سی۔بی اے پاس کڑی دا مڈل پاس منڈے نال ویاہ ہونا کوئی اچرج گل نہیں۔ساڈے پنڈاں وچ خاندانی جائیداد نوں بچان تے رشتہ داریاں ڈکن لئی ایہو جہے کئی جوڑ ہوندے آئے نیں۔اصل روگ اوس بھیڑی سوچ تے وسیب دا سی جہہڑی میرے چاچے تے اوہدے خانوادے دے اندر موجود سی۔(36)

نگہت خورشید نے اپنے افسانوں میں جہاں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے وہیں انہوں نے معاشرے کی منافقت کی جھلکیاں بھی دکھائی ہیں۔ان کا افسانہ" شیرنی "ہے۔جس میں ایک لڑکی کو رنگ روپ کی وجہ سے اسے نوکری مل جاتی ہے اور اگر کہانی" جنور "ہے تو زندگی کا زہر گھونٹ گھونٹ پیتی عورت کی بات ہے جو اس معاشرے میں مشکلات بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ایسی عورت اپنے آپ سے ایسے باتیں کرتی ہے:

کدی اوہنوں اپنے گھر والے اپنے مجرم لگدے جہہڑے آکھدے سن اسیں کیہ کریئے تیری قسمت !پر عورت دی قسمت کون بناندا اے۔دھی دے پیریں پگ رکھ کے اپنی عزت دا شملہ اُچا کرن والا پیو۔زمین دے ساک بھرا یا ذدھ دا واسطہ دے کے نیویں پا کے ٹُر ن دا درس دین والی ماں۔پر اوہ کوئی بیری نہیں تے نہ کوئی لُٹ دا مال سی جہہنوں ہر جاندا راہی ہتھ پائو ن نوں للچاندا سی(37)

سیدہ ظِل ہما بخاری پنجابی افسانہ نگاری کے میدان میں نیا اضافہ ہے۔ اُن کی کتاب " چھڈو رہن دیو2011 "ء میں چھپی۔ آپ کی کہانی میں تسلسل اور روانی کے ساتھ ساتھ روزمرہ کے مسئلے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ مسئلے جو گھریلو زندگی کے ساتھ جڑے ہیں ۔ گھریلو زندگی

کو جس قدر نزدیکی کے ساتھ ایک عورت دیکھ سکتی ہے، بیان کر سکتی ہے اُس کا حق آپ کی ان کہانیوں میں ادا کر دیا گیا ہے۔ مقصود ثاقب کے ماہوار" پنچم "میں 2011ء کے کہانی نمبر میں آپ کی کہانی" ٹُٹی ہوئی ودھر "نے پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ کہانی میں سادہ پن کو بڑی اہمیت دیتی ہیں یہی سادگی کا انداز اُن کے اسلوب کاخاصا بن جاتا ہے۔ 21 وی صدی میں کہانی کی جو لہر پوری دنیا میں ہے اُس کا خاصا بھی سادگی ہی ہے۔" بندبُوہا "کہانی میں عنصر مرکزی کردار ہے جس کو سوچوں میں ڈوبا ہوا ایسے دکھایا گیاہے:

سوچ دیاں پوڑھیاں کدی عنصر چڑھدا کدی لہندا جیب وچ خط اوہدی ہاں دے نال لگیا ہویا سی کدی دِل دھڑکن لگ جاندا کدی دِل سوچیں پے جاندا کہ ایہہ ہے کون(38)

افسانہ" اپنا کوئی نا'میں کوثر کا کردار بیان کیا گیا ہے جو لوگوں کے گھروں میں کام کر کے گزر بسر کرتی ہے۔ اُس کو کہیں بھی کوئی اپنانہیں ملتا، گھر جاتی ہے تو گھر والا اُس کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے باہر اُس کو سائیکل والا" سیر شیر "کے بہانے سے چھیڑتا ہے۔ یہاں کہانیکارہ نے عورت کے کردار کو بہت مضبوط دکھایا ہے کہ وہ کسی طرح کے حالات ہوں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا جان چکی ہے وہ سائیکل والے سے اپنی جان چھڑوانے کیلئے جو کرتی ہے اُس میں بہادری ہے چاہے گھریلو حالات سے دُکھی ہے پر وہ اپنے آپ کو کمزور نہیں ہونے دیتی:

سائیکل والے دے دل دی دھڑکن سائیکل دی کھڑ کھڑ توں ودھ گئی۔بڑی اُمید نال کوثر نوں تکن لگ پیا۔کوثر کجھ ہور نیڑے ہو گئی تے سِدھے اوہدے گلمے نوں ہتھ پا کے ٹھاہ مونہہ تے چپیڑ جڑ دِتی۔سائیکل والا سائیکل تے اپنے آپ نوں سنبھالدیاں ،مونہہ سہلاوندیاں نٹھ گیا تے کوثر اوہنوں گالھاں کڈھدی کم تے وگ گئی۔(39)

ظِلِ ہما بخاری کی کہانی" رب دی رحمت "میں بھوک و افلاس سے بھری زندگی گزارتے لوگوں کی کہانی ہے جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں یہاں تک کہ انور اپنی نوپیدائش بیٹی بھی اپنی بیوی کے علاج کیلئے ایک بے اولاد جوڑے کو بیچ دیتا ہے۔

انور مونہہ موڑ کے تے ٹٹے لفظاں نال بُھجیاں اَکھاں نال بولیا بس
سمجھ اوہنوں رَبّ نے تیرے لئی رحمت بنا کے بھیجیا سی۔ تیرے
علاج دے انتظام لئی بھیجیا سی میں بڑا مجبور ہو کے در در پھر کے
پیسیاں دا انتظام کرن دی کوشش کردا رہیا پر نہ ہویا فیر میں اوس
نرس دے اگے اک بے اولاد جوڑے اگے اپنی دِھی ویچ دِتی(40)

رفعت ایسی افسانہ نگارہیں جنہوں نے پنجابی کے ابتدائی دور کو بھی بہترین بنانے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔" اک اوپری کُڑی "کہانی سے رفعت کی کہانیکاری شروع ہوتی ہے اور یہ کہانیکاری کے میدان میں اور منزلیں ہی مارتی نظر آتی ہیں۔ رفعت کی کتاب" امرت نواس " چاہے جنوری 2015ء میں چھپی پر اس کتاب کی کہانیاں سویرانٹرنیشنل اور پندرہ روزہ رویل میں چھپ چکی تھیں۔ عورت جو علیحدہ علیحدہ رشتوں اوربندھنوں میں قید ہے وہ رسموں اورقدروں کی سب سے بڑی ماننے والی ہے ۔ ان رسموں رواجوں کیلئے وہ جو قربانیدیتی ہے اُس کے الٹ مرد ویسی قربانی نہیں دے رہا۔ بلکہ وہ عورت کو ایک ٹول کی طرح استعمال کر رہا ہے اُسے جنس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا اور جن عورتوں نے اس راز کو جان لیا ہے وہ جنس زدہ معاشرے میں اپنا حق مانگنے کیلئے اپنی بولی لگواتی ہیں۔ وہ جو آزادی کی مانگ کرتی ہیں،اس کے ساتھ قید بھی بانٹی ہیں اور اپنے وہ مقصد بھی حاصل کرلیتی ہیں جس کے ساتھ انہیں تھوڑا سا آگے بڑھنے کیلئے ایک سیڑھی ملتی نظر آتی ہے۔ رفعت نے اپنی کہانیوں کے جاندار کرداروں کو جاندار اندازمیں بیان کر کے اہم کام کیا ہے اور وہ گم وقت میں چلی جاتی ہیں یہ وہوقت ہے جب تقسیم کا معاملہ شروع نہیں ہوا تھا اور کندن سٹریٹ میں امرت نواس اُس کوماضی میں جھانکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جیسے کہ وہ لکھتی ہیں:

کُنڈ ن سٹریٹ میں سوچاں تے یاداں وچ ڈُب گیا۔ کنڈن سٹریٹ وچ
تے ایہدے مونڈھے نال کھلوتا "امرت نواس " دی تے ایہہ ہُن
"جگدیش نواس "امبرسروں آئے میرے چاچے مہاجر جوائی دے کلیم
وچ آ گیا اے تے تھوڑے چر دے مقدمے دے بعد ایہناں نوں
ایہدا قبضا وی مل گیا اے۔(41)

یہ امرت نواس روح کا وہ لانبو بن گیاہے جو ہمیشہ ہی اُس کو ماضی کیادوں میں جلاتا رہتا ہے اور اُس کی تپش اُس کو جیون کی خوشیوں کو جاننے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ اس اندر کی جنگ کو رفعت اس طرح بیان کرتی ہیں:

امرت نواس تے میری روح دا اوہ لانبو اے جہہڑا ایہناں دناں
وچ کدی ٹھنڈا نہیں ہویا۔ ایہدا سیک تے ودھدا ای رہیا میری
کھبی اکھ وچ آکھدے نیں کالا موتیا اُتر آیا اے پر مینوں انج جاپدا
اے جے میں اج وی جگدیش نواس دی باہرلی باری وچوں کھلو کے
مونگیا تے کالے رنگ دے روغنی پیالیاں وچ لگے تُلسی، دھنیا، پودینا
تے سورج مکھی دے بوٹیا وچ چ، ٹی دھوتی وچ اپنا آپ ولھیٹ کے
دھوتی نال سر کج کے جہدی کالی کنی ایہدے متھے تے آئی ہوندی
اے تے ہتھ وچ تیل دی چمکدی گڑوی تے بالٹی لے کے نیڑے
چھت دی شہ نشین تے رکھ دیندی۔(42)

کہانی" ہتھیں دِتی گنڈھ "میں کئی موضوع سمائے گئے ہیں اس میں انسانی نفسیات کا رنگ بھی ہے اور ہجرت کے مسائل میں اُجڑ جانے والوں کی بات بھی موجود ہے۔ جب صفیہ اپنے ارد گرد والوں کی کھلے ہاتھ سے مدد کرتی ہے تو لوگ سر جوڑ کر باتیں کرتے ہیں:

نی ایہہ صفیہ دے گھر دا کردا کیہ اے؟ ایڈا خرچا کھلے ہتھیں
کردی اے ماں تاجاں سلام کرن آئی ایہنوں دس دس دے دو

نوٹ دے دتے۔ گامے دی بیوا آئی جے یحیٰ دا ویاہ اے تے مدد کرو۔ ایہنوں سو روپے دے تن سوٹ ہٹی توں منگا دتے۔(43)

اور پھر جب ہندوستان سے آئے اُجڑے لوگوں کی بات ہوتی ہے تو رفعت بڑے دھیمے سے انداز کے ساتھ اس کو بھی اپنی کہانی کے کرداروں کے ساتھ پڑھنے والے کو اُس سمے میں لے جاتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

پر نال ای پاکستان بن گیا تے اسیں سارے رُل بُل کے کھلر گئے۔ میری اماں تیری نانی بیمار شمار رہن لگ پئی تے ابے نے میرا ویاہ کر دتا۔ میں ایس گھر آ گئی رولیاں وچ ایہناں دی ووہٹی تے بچیوڈھیاں گئیاں سن۔ ہُن ویکھ تینوں کنا پیار کردا اے اپنے بالاں دی وڈی بھین آکھدا اے۔ پر امی دیاں گلاں سُن کے میریاں اکھاں وچ اتھرو آ جاندے نیں۔(44)

سیما پیروز کی کتاب" کچ دا رشتہ "میں کُل 12 کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ کہانیوں کی کتاب 2015 میں آئی، سیما پیروز کے کریڈٹ میں ایک اور اضافہ ہے۔ ان کی کہانیوں میں سماج کے طور طریقوں کے رنگ ملتے ہیں۔ وہ عورتوں کے دُکھ درد کو بیان کرنا چاہتی ہی اور خواتین کو کسی بھی قسم کی مشکل میں نہیں دیکھ سکتیں۔ اسی لئے تو وہ" قصہ کہانی "میں سیاں بارے کہتی ہیں:

امی جی !اوہدے کولوں کم از کم صفائی تے نہ کرائو۔ اوہ وچاری جدوں فرش تے ٹاکی ماردی اے تے ڈر لگدا اے کہ کجھ ہو نہ جائے۔(45)

گھروں میں کام کرنے والیوں کے دُکھ کو وہ اس طرح بیان کرتی ہیں:

بی بی تُسیں کیہ گلاں کردے او۔ اسیں تے تیجے دن اپنے گھر دا کم کاج کرن لگ پینے آں۔ بی بی ایہہ نخرے امیراں دے نیں اسیں مزدور لوک آں۔ کم نہیں کراں گے تے کھاواں گے کتھوں؟ اوہدا

ہاسا عجیب جیہا سی۔خورے اوہدے وچ ہوکا سی اتھرو یاں طنز سی۔(46)

جب وہ ایک ہی طریقے سے نوکر، نوکرانی، کوارٹر، کام کرنے کی عادت نہیں تھی، تبادلہ، سرکاری گھر کو ہی ہر کہانی میں لے آتی ہیں، افسانہ پھکڑ پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے وہ کوئی نیا پن نہیں لائیں۔ کرداروں کے حوال سے بھی بشیرے، سیدں، رانو وغیرہ کے نام والے کردار بیان کر کر پنجابی افسانے کو ایک خاص دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیتیں۔ گھر سے بھاگ جانے والی عورتوں بارے سیما پیروز اپنی کہانی "کچ دا رشتہ "میں لکھتی ہیں:

بشیرے توں ٹھیک آکھیا سی۔بیوی تے اوہو ای ہوندی اے جیہڑیاں سہریاں نال ویاہ کے لیائو۔جیہڑیاں عشق پچھے ماں پیو دی عزت پیراں ہیٹھ رول کے گھر دی دہلیز الانگھ آئو ندیاں نیں اوہ رکھیل تاں بن سکدیاں نیں پر کسے گھر دی عزت نہیں بن سکدیاں۔بس مینوں ایس سماج۔معاشرے نال صرف اِکو ای گلہ اے۔ساڈے دووواں دا جُرم اِکو سی۔پر سزا صرف مینوں ای کیوں مل رہی اے۔ایہہ ناانصافی اے۔(47)

بشیرے نے اپنے ساتھ بھاگنے والی عورت کو ہی مجرم مانا ہے اور اُس کو ہی سزا دیتا ہے جبکہ اُسی جرم کا بڑامجرم تو وہ خود بھی ہے۔ یہاں سیما پیروز نے سماج کی مجموعی سوچ کو بھی بیان کیا ہے جو عورتوں کو مجرم بناتا ہ اور مردوں کو نواں نکور بنا دیتا ہے۔نیلم احمد بشیر کے پنجابی افسانوں کا مجموعہ" ہر گچھا زخمایا 2018 "میں چھپی۔ نیلم کی کہانی میں کرداروں کے اردگرد کہانی گھومتی ہے۔ کرداری کہانی میں تبدیلی لاتی ہیں اور ایسے محسوس ہوتاہے یہ کردار اُن کے جیتے جاگتے کردار ہیں جس کو کہانی کارہ نے اپنی قید میں نہیں رکھا ہے۔ جس کی بدولت افسانے میں بناوٹی رنگ تو بالکل ہی دکھائی نہیں دیتاہے۔ آپ کی کہانی" اجازت "کے کردارو ں میں علیحدہ علیحدہ رویّے دکھائی دیتے ہیں۔ روبی یہاں تو اپنے دوست رضا کو پنا دِیا نام رضی کہہ کے پکارتے ہوئے ایک دم ماڈرن لڑکی ہونے کا اظہار کرتی ہے اور رضی کو روکتی ہے کہ وہ کسی ٹین

ایجر کی طرح کا رویہ نہ رکھے اور اُس کے ساتھ بھی کسی قسم کا رشتہ بنا لے پر شادی اور پیار وہ نہیں کر سکتی۔

> ویکھ نا، میں عشق محبت دا روگ نہیں پال سکدی۔ایہہ بڑا پرانا تے بے کار اولڈ فیشن جذبہ اے۔مینوں بڑے کم کرنے نیں توں سمجھدا کیوں نہیں؟(48)

وہ عشق کو پچھلے زمانے کی بات سمجھتی ہے جو اس زمانے میں ایک بے کار شے ہے۔ ا سی لئے تو وہ بہت زیادہ بولڈ ہو کے رضا کو کہتی ہے" جاؤ، جاکر جو مرضی جس کے ساتھ مرضی کر لو "...یہاں افسانہ نگار 'ایسی عورت کا کردار دکھاتی ہیں جو بہت ماڈرن خیالات میں جینا چاہتی ہے اور سماج کے خلاف ہر قدم اٹھانے کیلئے تیار ہے۔ وہ اپنے رضاکے ساتھ اُس کی ہر" رضا " کو پورا کرنے کیلئے بھی تیار ہے۔" پیا ملن "ہمارے سماج کی کڑوی حقیقت وربھیانک تصویر دکھاتی کہانی ہے۔ اس کہانی میں مصنفہ نے شدت پسندی اورمذہبی دہشت گردی کو موضوع بنایا ہے۔" جھلمل بیوٹی پارلر ' 'میں تیار ہو رہی دلہنیں اپنے اپنے پیار کے لئے ہاتھوں پرمہندی لگا رہی ہیں اورخوب سج رہی ہیں تو خودکش حملے والوں کی تیاری دیکھیں:

> لاڑیاں والے وی اپنے سوہنے جوان لاڑیاں نوں بڑے دھیاں نال تیار کروا رہے سن۔اوہناں دے وڈے بابے اپنے جواناں نوں آن والی زندگی دے بارے مَتّاں دے رہے سن۔لاڑیاں نے نوین کپڑے جوگر،نویاں ٹوپیاں پائیاں ہوئیاں سن تے شلواراں تھلے اپنے جسم دے اپنے مردانہ حصے اُتے پتلی جیہی لوہے دی حفاظتی چادر بنھ رہے سن۔(49)

اس افسانے کے شروع میں افسانہ نگارنے علیحدہ علیحدہ کرداروں کے رنگ بیان کیے اوردہشت گردی اور اس کے ساتھ ہونے والی تباہیوں کو موضوع بنایا ہے جس نے ہمارے سماج کواندر سے کھوکھلا کر چھوڑا ہے۔ یہ مذہبی شدت پسندوں کی بھی کیسے برین واشنگ کیجاتی ہے اور

ان کو" حُوروں "کے لالچ کے ساتھ دنیا کو جہنم بنایاجا رہا ہے ان کے پیچھے کون ہے اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکاہے۔

ایہہ کہیہو جہی جنج اے ۔ساریاں ووہٹیاں چُپ کر کے تُری جا رہیاں نیں۔ نہ کوئی ڈھول بتاشا،بس اخیر وچ اک ایسی براتن ٹُر دی نظر ا?ندی پئی سی جہیڑی دف وجاندی،خُشی نال ٹُھمکے لاندی،مٹکدی،نچدی،چھالاں ماردی ٹُردی پئی سی۔ہوا گھبرا کے اگے ودھی تے اوہدا لال گھنڈ اُڈا کے رکھ دِتا۔ایہہ ویکھ کے اوہ اک دم پچھے ہٹی ، گھنڈ پچھے کوئی چہرا نہیں سی۔(50)

اسی سرح اُن کی کہانیوں میں نئے موضوعات ہیں جو پنجابی کہانی کے میدان میں بہترین اضافہ ہیں۔عذرااصغر بھی پنجابی کانی لکھنے والوں میں ایک نیا اضافہ ہیں پچھلے دنوں اُن کی کہانیوں کی کتاب پلاک کی طرف سے چھپی ہ جس میں کل9 کہانیاں ہیں اورترجمہ کی گئی کہانیاں بھی شامل ہی۔ آپ نے اردو کی کہانیاں لکھ کے نام کمایا ہے اب انہوں نے پنجابی کہانیوں کی طرف دھیان دیا ہے ویسے توں انہوں نے چالیس برس پہلے پنجابی کہانی لکھناشروع کی تھی۔ آپ کی کہانیکاری بارے بات کرتے ہوئے تنویر ظہور لکھتے ہیں:

عذرا اصغر نے اردو افسانیاں دی طرح پنجابی افسانیاں وچ وی معیار قائم رکھیا تے اوہناں دے پنجابی افسانے وی بہت پسند کیتے گئے۔(51)

عذرااصغر کے 9 افسانے اپنی تخلیق ہیں جو64 صفحات پر مشتمل ہے۔ باقی چھے مختلف زبانوں کا ترجمہ ہیں۔ ایک کہانی مصری، ایک ہنگری اور دو دو افسانے بلغارین اور ایرانی ہیں۔ اس کتاب کی پہلی کہانی" محبت کا کنول "ہے جو ایک رسالہ آنے پر اُس پڑھتے ہوئے ماضی میں ن اکام ہوئی محبت کییادوں کے ارد گرد گھومتی ہے، جب محبت کو یاد کرتی ہے تو ساتھ نفرت کے جذبات بھی نظر آتے ہیں جس وجہ سے اُسے محبت اور نفرت ترازو کے دوپلڑے لگتے ہیں جو

ایک لکڑی میں ہیں۔ کہانی کا کردار جونی ہے جس کے ساتھ یادگاری اور ناکام محبت کو باربار بیان کرتی جا رہی ہے۔

یہ افسانے کے آخر پر پتہ چلتا ہے کہ محبوبہ کو اُس کی ڈھلتی جوانی میں محبوب چھوڑ کر چلا گیا کیوں کہ ایک رسالے میں اُس کی تحریر ک ساتھ ہی ایک نیانام نظرآتا ہے اور خیالات کچھ ایسے بن جاتے ہیں:

تیری متلاشی محبت نوں نویں جوانی لبھ پئی اے۔جوانی !نویں محبت
تینوں مبارک ہووے پر ایہہ خیال رکھیں جدوں میری محبت دی جوانی
تینوں کلا چھڈ کے ٹُر جاوے تے یاد رکھیں کوئی تینوں ذور بیٹھا
تیری محبت دے لائے کنول دے بوٹے نوں سینچ رہیا ہوئے گا تے
تیری اُڈیک اوہدی حیاتی ہووے گی۔(52)

اُن کے افسانے" سکینہ "خواتین کے حقوق کے کیلئے کی گئی کوششوں کی کہانی ہے۔ سکینہ اپنا گھر بساتے بساتے قبر میں چلی گئی پر کوئی اُسے یاد کرنے والا ہیں۔ اسی ہی خیال کو عذرا اصغر ایس لکھتی ہیں:

خورے کنیاں کُڑیاں سکینہ وانگوں اپنے گھر وسنا چاہندیاں نیں تے
ساری حیاتی قسمت دے لیکھے نال لڑ دے لڑدے تھکی، بھرُ بھری مٹی
وچ جا سوندیاں نیں۔(53)

بے زبان جانوروں کی بات کرتے ہوئے علامت کے ذریعے عذرا اصغر نے" بے زبانی "میں عقل والے لوگوں میں پیار نہ ہونے کو موضوع بنایا ہے۔ کہانی میں نصیحت لینے والی باتیں کرتے ہوئے اخلاقی درس دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔" یاداں دا اُجیار "ماضی کی ایک خوبصورت یاد کے گرد گھومتی کہانی ہے۔ یہ ناسٹلیجیا کو بیان کرنے کاخوبصورت انداز" موتیے دیاں کلیاں "میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ظفر پرانے وقت کو ایسے یاد کرتا ہے:

اوہ فیروزی چُنی والی نل جائے تے اوہدے قدماں وچ بہہ جاواں
تے زندگی گزر جاوے۔ویلا لنگھدا جاوے تے میں اکھاں بند کیتی

اوہدے قدماں وچ بیٹھا رہواں...بس اوس ویلے تے ایہو خواہش سی۔(54)

صغرا صدف نے اپنی کتاب" برہا بچ مچایا "2019 میں سماج میں بستے لوگوں کی سوچ پر چوٹ کی ہے جو آج بھی بیٹیوں کے پیدا ہونے پر دُکھی ہو جاتے ہیں۔کہانی کا مرکزی کردار مائی عاشاں ہے جو تقسیم کے وقت سکھ خاندان سے بچھڑی اورا یک مسلم خاندان میں اپنی زندگی گزار رہی ہ اُس کی مثالیں دوسری خواتین بھی اس طرح دیتی ہیں:

عورت اوہ ہوندی اے جو نبھانا چاہندی اے۔(55)

مائی عاشاں وہ کردار ہے جس کے من میں جھانکنے کیلئے کہانی بیان کرنے والی کا دل کرتاہے تو وہ اس کے ماضی بارے جاننے کیلئے اتاولی ہو جاتی ہے کیو نکہ اگر وہ سامنے والے گھر ہی رہ رہی ہے۔ مائی ک کردار بار کہانی کارہ کے خیالات دیکھتے ہیں:

ایہہ آکھیا جاوے تے کوڑ نہیں ہووے گا جے مائی رج کے سوہنی سی۔میدے ورگا رنگ،سوہنے تِکھے نین نقش،لک پتلا،جُسا بانکا،قد اُچا،وال لمے تے کالیاں اکھاں جہناں'چ جھاتی پا کے اوہناں بارے کجھ آکھنا بہوں اوکھا کیوں جے اوہ اپنے کم نال کم رکھدی تے گھٹ کسے ول تکدی سی۔(56)

اس مائی عاشاں کو جو اوس وقت اٹھارہ سال کی ہو گی، تقسیم کے وقت لالہ سردار نامی پینتالیس سالہ بندہ اپنے گھر لے آیا جس نے بعد میں اُس سے نکاح پڑھوایا اوراپنی دوسری بیوی بنا لیا۔ مائی عاشاں جب مر جاتی ہے تو اُس کے گلے میں جو تعویذ ہے اُس میں ساریکہانی چھپی ہوتی ہے جس کو مُردے نہلانے والی ماسی سکینہ نے اپنے پاس سنبھال لیا اور کہانی بیان کرنے والی نے اُسے تلاش کر لیا۔ کہانی میں دلچسپی کا عنصر شروع سے لے کر آخر تک ساتھ ساتھ چلتا ہے بلکہ آگے کیاہو گا ، یہ سوچ قاری کی دلچسپی بھی برقرار رکھتی ہے۔ کہانی کے یہ جملے کہانیکے مرکزی خیال کو اس طرح بتاتے ہیں جس کے ساتھ خاتون کی نفسیات دیکھی جا سکتی ہے:

"اوہ جِنا چِر جیوت رہی روبورٹ وانگ حرکت کردی رہی۔ایس لئی
نہ اوہنوں بالاں نال پیار ہویا نہ گھر بار نال۔اک دیہاڑی داڑ وانگ
لگی رہندی سی۔ [57]

آپ کی کہانی" دارُو "میں کہانیکار کی سوچ اور فلسفے کا سایہ بہت گہرا ہے کیوں کہ اس کو کہانیکارہ نے اپنی کہانی کے واقعات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ کہانی اُن بندوں کے بارے ہے جو بیرونی ممالک میں زندگی گزار رہے ہیں۔ نیلو کو انور صرف اپنے مفاد کیلئے استعمال کرتا ہے اور وہ صرف اور صرف وہاں پکا ہونے کیلئے کسی بھی حد تک جا سکتا ہ۔ یہاں کہانیکارہ نے بدیس میں بسے لوگوں کی نفسیات کو بڑی اچھی طرح بیان کیا ہے اور حقیقی رنگ کے ساتھ کہانی بیان کی ہے۔ انگریز خاتون پنجابیوں کے اس فطری انداز کو بھی جان چکی ہے اس لئے تو وہ کہتی ہے:

پتہ نہیں کیوں ایک آدھ بار میرے مونہوں نکلے کیوں اک ادھ واری
میرے مونہوں پنجابی دے اکھر سُن کے انور دے متھے تے وٹ پے
گئے۔مینوں لگا اوہ اپنی بولی نوں دوجیاں وانگ نہ سمجھدا اے۔
میں چُپ ہو گئی تے احتیاط کرن لگ پئی کہ اوہدے ساہمنے پنجابی نہ
بولاں۔ [58]

اس سماج میں نئی اشیا کے استعمال کے ساتھ کیا کیا تبدیلیاں آ رہی ہیں اور سماج کے اندر کی سچائی کیا ہے اس کو صغرا صدف نے اپنی کہانی" ان بوکس "میں بیان کیا ہے۔ عنوان تو ان بوس لکھا گیا ہے جبکہ کہانی میں" ان باکس "یہاں بھی یکساں پن نہ ہون کی وجہ سے قاری کیلئے اسی طرح کا مسئلہ پیش آتا ہے جیسا اورافسانوں میں ہے۔" ان بوکس "کے سطور کے اندر چھپے پیغام کو واضح کرتی ہیں:

سوشل میڈیا نے جتھے بہت ساریاں اسانیاں پیدا کیتیاں نیں اوتھے جنس
دے حوالے نال بالاں نوں ویلے توں پہلوں جوان کر دتا اے تے
اوہ ہر عورت نوں اِک نظر نال ویکھن لگ پئے نیں۔ [59]

خواتین کی کہانی کاری کے حوالے سے پنجابی زبان میں مقام رکھنے والی کہانی کارہ پروین ملک ایسے لکھتی ہیں:

> کہانیاں کہنا سوانیاں نوں سوبھدا اے۔رَبّ ولوں اوہنا ں نوں گل کہن دی کڑی جو ڑ کے اگے ٹورن دا وسب ملیا اے تے جیہڑی سوانی نوں ایس گل دی جانکاری ہووے اوہ پک نال وڈی کہانیکار بن سکدی اے۔(60)

اکیسویں صدی کے پہلے دو عشروں میں پنجابی افسانہ نگار خواتین نے زندگی کے ہر رنگ کو موضوع بنایا ہے اور ان کے فن کو دیکھا جائے تو تکنیکی لحاظ سے بھی بہت بدلاؤ دیکھا گیا ہے۔ اس وقت عالمی سطح پر تکنیکی لحاظ کے ساتھ جو تجربے ملتے ہیں ان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ اس وقت کہانی ایک مخصوص دائرے سے باہر نکلی، سوشل میڈیا اورانٹرنیٹ کے ذریعے جو ترقی ہوئی اُس کو بھی کہانی لکھنے والوں نے بیان کیا ہے۔ مجموعی طورپر دیکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ خواتین نے اپنی کہانیوں میں زبان و بیان اور موضوع کے نئے پن کے ساتھ پنجابی افسانے کو ترقی کی طرف لے جانے میں اپنا بڑا کردارادا کیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ عذرا وقار'اک آدرش وادی دی موت)لاہور :سچیت کتاب گھر 'شرف مینشن 'گنگا رام چوک 'فروری26(2000 ۔

2۔ ایضاً۔56۔

3۔ غزالہ حمدانی،ڈاکٹر،اَج دی ماروی)ملتان :جھوک پرنٹرز،جنوری17(2000۔

4۔ ایضاً۔53۔

5۔ ایضاً۔13۔

6۔ شگفتہ نازلی 'روپ سروپ 'لاہور 'بزم فقیر پاکستان49 فیروز پور روڈ اچھرہ 2001 ' ص34۔

7۔ زویا ساجد،سرل سول)لاہور:رُت لیکھا22میاں چیمبرز ٹیمپل روڈ،جنوری17(2001۔

8۔ ایضاً۔69۔

9۔ عبیدہ سیّد، فیر کیہ ہویا)لاہور:بزم فقیر پاکستان2002ء8(۔

10۔ ایضاً۔18۔

11۔ رفعت،بتی والا چوک)لاہور :ادارا پنجابی زبان و ثقافت24امیر روڈ بلال گنج،مئی (2003فلیپ

12۔ صوفیہ شاذ، اجیت پریتاں)لاہور:مقصود پبلشرز اردو بازار،29(2003۔

13۔ ایضاً۔39۔

14۔ ایضاً۔14۔

15۔ پروین ملک 'نِکے نِکے دُکھ) لاہور:پنجابی ادبی بورڈ 'فروری3 (2004 ۔

16۔ ایضاً۔65 ۔

17۔ ایضاً۔64۔

18۔ ایضاً۔69 ۔

19۔ ایضاً۔94 ۔

20۔ کلانچوی،مسرت، تھل مارو دا پینڈا(ملتان:سرائیکی اَدبی بورڈ رجسٹرڈ،25(2005۔

21۔ ایضاً۔32۔

22۔ فرخندہ لودھی 'کیوں(لاہور:پنجابی مرکز 'اپریل14)2006 ۔

23۔ ایضاً۔41 ۔

24۔ ایضاً۔49 ۔

25۔ دلشاد ٹوانہ 'ڈاکٹر 'پچھتاو (لاہور : بزم فقیر 3-B-s/25 ' ٹاؤن شپ27)2007 '۔

26۔ ایضاً۔67۔

27۔ رابعہ خان ،ساہویں سُول بسیرا(ملتان:جھوک پبلشرز بیرون دولت گیٹ قلعہ کہنہ قاسم باغ،7(2007۔

28۔ ایضاً۔24۔

29۔ ایضاً۔62۔

30۔ سعیدہ مختار یونس ‘ڈونا روپ لاہور:سچیت کتاب گھر ‘اشرف مینشن چوک گنگا رام ‘ دسمبر2008ء2۔

31۔ ایضاً۔13۔

32۔ ایضاً۔50۔

33۔ شاہ،شاہدہ دلاور،تڑ کے گھڑے دا پانی لاہور :مسعود کھدر پوش ٹرسٹ،دیال سنگھ مینشن دی مال روڈ،200891۔

34۔ ایضاً۔7۔

35۔ ایضاً۔30۔

36۔ نگہت خورشید نارو،ڈاکٹر،ہر گُچھا زخمایا لاہور:پاکستان پنجابی فکری سانجھ،43 2010۔

37۔ ایضاً۔51۔

38۔ بخاری،ظل ہما،چھڈو رہن دیو لاہور :سچیت کتاب گھر11 شرف مینشن چوک گنگا رام،جنوری81 2011۔

39۔ ایضاً۔15۔

40۔ ایضاً۔52۔

41۔ رفعت،امرت نواس لاہور :پنجابی مرکز،کوچا محمدی سلطان پورا،129 2015۔

42۔ ایضاً۔129۔

43۔ ایضاً۔112۔

44۔ ایضاً۔113۔

45۔ سیما پیروز،کچ دا رشتہ لاہور :پاکستان پنجابی ادبی بورڈ19 ۔

46۔ ایضاً۔18۔

47۔ ایضاً۔70۔

48۔ نیلم احمد بشیر، ہر گُچھا زخمایا لاہور :بلاک 1 قذافی سٹیڈیم فیروز پور روڈ، اپریل 12 (2018۔

49۔ ایضاً۔23۔

50۔ ایضاً۔26۔

51۔ عذرا اصغر ،موتیے دیاں گلاں لاہور:پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگوایج آرٹ اینڈ کلچر، 1 قذافی سٹیڈیم فیروز پور روڈ، اپریل 99 2018۔

52۔ ایضاً۔10۔

53۔ ایضاً۔15۔

54۔ ایضاً۔41۔

55۔ صغرا صدف، برہا مچ مچایا لاہور:پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگوایج آرٹ اینڈ کلچر، 1 قذافی سٹیڈیم فیروز پور روڈ، اپریل 15 2019 ۔

56۔ ایضاً۔16۔

57۔ ایضاً۔23۔

58۔ ایضاً۔37۔

59۔ ایضاً۔129۔

60۔ شاہ، شاہدہ دِلاور، ترِڑ کے گھڑے دا پانی۔8۔